Rooh-e-Tahqeeq, Vol.03, No.01, Serial No. 07, January-March 2025

انتظار حسین کا "شہر افسوس": تنقیدی مطالعہ

Intizar Hussain's "Shehr e Afsos": A Critical Study

Dr. Muhammad Said Ali
Lecturer in Urdu, Ghazi University, Dera Ghazi Khan
saidalijatoi14@gmail.com

Shazma Zahra
Lecturer in Urdu, Govt. Associate College for Women,
Choti Zareen, Dera Ghazi Khan
honey.honeykhan786@gmail.com

Aasma Zahra Khan
PhD Research Scholar (Urdu), The Women University, Multan
aasmazahrakhan@gmail.com

Abstract:

Intizar Hussain is a renowned short story writer and novelist of our age. He also earned name in the field of Drama, Travelogue, Criticism, Journalism, Column writing, Sketch writing and Translation. Intizar Hussain wrote four novels and nine story books, while "Shehr e Afsoos" is Intizar Hussain's 4th legendary collection. It contains seventeen stories in which the colour of symbol, myth and ancient stories is prominent. This article is a critical study of the stories of such legendary collection.

Keywords:
Short Story, Allegory, Colonialism, Progressivism, Modernism, Symbolism, Abstractism.

انتظار حسین (۱۹۲۵ـ۲۱۰۶ء) نے یوں تو اکانوے برس زندگی پائی۔(۱) مگر اُن کے اندر کا گنتر دھیہ (کہانی کار) پیدا ہوا، پاکستان کے پیدا ہوتے ساتھ۔ انہوں نے پہلی کہانی "قیوما کی دوکان" ۱۹۴۷ء کی ہجرت سے متعلق لکھی۔ جس میں مِٹتی جلتی تہذیب کا نوحہ، گلی محلوں کے خالی ہونے اور اپنی بستی سے ہجرت کا کرب دکھائی دیتا ہے۔(۲) یوں انتظار حسین نے قریباً اَڑسٹھ برس کہانیاں سنائیں۔ ان کی تمام تر کہانیاں "گلی کوچے"، "کنکری"، "آخری آدمی"، "شہرِ افسوس"، "کچھوے"، "خیمے سے دور"، "خالی پنجرہ"، "شہر زاد کے نام" اور "نئی پرانی کہانیاں" کے عنوان سے، یعنی کل نو افسانوی مجموعوں کی شکل میں سامنے آئیں۔ بعد ازاں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے ان کی کل ۵۲۱ کہانیوں کو دو جلدوں "جنم کہانیاں"، "قصہ کہانیاں" اور آخر میں "مجموعہ انتظار حسین" کے عنوان سے ایک ہی جلد میں جوڑ لیا۔(۳)

اس مضمون میں ہم انتظار حسین کے چوتھے افسانوی مجموعے "شہرِ افسوس" کا تنقیدی مطالعہ کریں ہے۔ پہلا افسانہ "وہ جو کھوئے گئے" چار آدمیوں (زخمی سر والا، تھیلے والا، نوجوان اور باریش بزرگ) کی کہانی ہے۔ چاروں گھنے جنگل میں کھو چکے ہیں اور اپنی یادداشت بھی گنوا بیٹھے ہیں۔ انہیں یاد نہیں کہ ان کی بستی، ان کے ماں باپ، بہن بھائیوں اور اپنوں کے ساتھ کیوں جل گئی۔ اور وہ کیسے یہاں تک پہنچے۔ وہ غرناطہ سے آئے ہیں کہ فلسطین سے، یا پھر جہاں آباد سے؟ وہ کون ہیں؟ اور وہ ہیں بھی کہ نہیں؟ :

> "زخمی سر والا تلخ اور افسردہ ہنسی ہنسا: 'میں اُکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لیے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا دلی کی گلیوں سے نکلا ہوں یا بیت المقدس سے اور یا کشمیر سے۔۔۔ ہم اپنا سب کچھ تو چھوڑ آئے تھے مگر کیا ہم اپنی یادیں بھی چھوڑے آئے ہیں؟" (۴)

پھر اچانک انہیں یاد آتا ہے کہ ان میں سے ایک آدمی کم ہے۔ وہ سبھی گنتی کرتے ہیں اور کتے کے بھونکنے پر اُسے ڈھونڈنے نکل پڑتے ہیں۔ مگر انہیں نہ کتا ملتا ہے اور نہ ہی گمشدہ ساتھی۔ پھر وہ اس سوال میں کھو جاتے ہیں کہ اُن کا ساتھی کون تھا۔ اس کا چہرہ و نام؟ عورت تھی یا مرد، انسان تھا کہ جانور۔ یا پھر کوئی بلا، جو شاید اس عفریت کدے میں اُن کا پیچھا کر رہی ہو۔ پھر وہ جھر جھری بھرتے ہوئے خود کو مطمئن کرتے ہیں کہ اصل میں "ہم نے اپنے آپ کو تو گنا ہی نہیں"۔ اچھا تو وہ اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر اس سے بھی وہ مطمئن نہیں ہوتے اور نہ نظر آنے والے بھونکتے کتے کی نشاندہی پر اپنے گمشدہ ساتھی کو ڈھونڈنے نکل پڑتے ہیں۔

یہ ایک علامتی کہانی ہے۔ اپنے جلتے گھروں اور عزیزوں کو چھوڑ آنے والوں کی کہانی۔ جو ابھی تک اس سوچ میں سر گرداں ہیں کہ اُن کی اصل تھی کیا۔ غرناطہ، فلسطین، کشمیر، دہلی یا کچھ اور۔ اُن کا اپنا نام، چہرہ، قوم، اپنا آپ، آن پڑی آفت، گمشدگی اور یہ نئی جگہ، وہ کچھ بھی تو نہیں جانتے تھے۔ تقسیمِ ہند کے فسادات اور ہجرت میں بھی تو مسلمان ایسی منتشر سوچوں میں غلطاں تھے۔ ہم کون ہیں۔ کیا ہیں۔ کہاں سے، کیسے اور کیوں نکل پڑے ہیں۔ اور جو اپنی بستی سے نہیں نکلے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ کون تھے، کیسے تھے۔ ان کا نام اور پہچان کیا تھی؟ یہ سبھی سوال آج پچھتر برس بعد بھی اسی طرح ستاتے ہیں۔ انسانی زندگی کو اُسی طرح متزلزل کرتے ہیں۔

افسانہ "کٹا ہوا ڈبا" چار بوڑھوں کی دلچسپ گفتگو سے متعلق ہے۔ جو چلم جلا اپنی زندگی کے بیتے دن یاد کر رہے ہیں۔ پرانے وقتوں کے سفر اور تجربات، ریل گاڑی کے سفر اور نت نئے واقعات و مشاہدات۔ منظور حسین جوانی کے دنوں میں سامنے والی ٹرین سیٹ پر بیٹھی ایک سانولی سلونی کو یاد کرتا ہے۔ جو ایک سٹیشن پر دوسری گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کو بتانا چاہتا ہے کہ کس طرح اُس دور جاتی ٹرین کا ڈبا کٹ کر پٹری پہ کھڑا رہ گیا اور اس میں بیٹھی من موہنی صورت آج تک اس کے دل کے نہاں خانوں میں بسی ہوئی ہے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ بتا پایا۔ "کٹا ہوا ڈبا" تو دوسری پٹری پر ہی چھوٹ گیا تھا۔ اور اس کی ٹرین بہت دور نکل آئی تھی۔ اس افسانے میں کہانی سے کہیں زیادہ جزئیات نگاری، منظر نگاری، انسانی حرکات، محسوسات، آس پاس کی چیزوں اور زبردست اندازِ بیان سے مدد لی گئی ہے۔ انتظار حسین کی اسی صفت کو ڈاکٹر انوار احمد یوں بیان کرتے ہیں :

> "انتظار حسین اور کہانی لازم و ملزوم ہیں۔ قصے کہانی کا خمیر اور انتظار کی اصل دو جدا جدا چیزیں نہیں۔ منٹو اور غلام عباس کے بعد وہ پاکستان میں اُردو افسانے کی کائنات کا تیسرا اہم کردار ہے۔ اسے انفرادیت کی تمنا ترقی پسند تحریک سے دور لے گئی۔ انتظار حسین کو اپنے بعض ہم عصر افسانہ نگاروں پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ کہنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔" (۵)

کہنے کا ڈھنگ تو واقعی کمال ہے۔ اب اسی کہانی "کٹا ہوا ڈبا" کو لے لیجیے۔ کہانی کا مرکزی کردار ٹرین کے ڈبے کو یاد کر رہا ہے۔ مگر وہ پوری کہانی میں کچھ بھی تو نہیں بتا پایا ہے۔ گویا نہ بتانے میں ہی سب کچھ کہہ جانے کا راز چھپا ہو۔ مگر اس کے ارد گرد کے لوگ اِدھر اُدھر کی کئی کہانیاں کہہ جاتے ہیں۔ اس کہانی کے ایک کردار مرزا صاحب، زمانہ قدیم میں سفر، اس کی صعوبتوں اور رات کی طوالت پر کیا خوب گفتگو فرما رہے ہیں، ذرا آپ بھی سنیے :

> "جب سفر قیامت کا ہوا کرتا تھا۔ سیکڑوں میل آگے، سیکڑوں میل پیچھے، دیس اوجھل، منزل گم کہ لگتا تھا جیسے آخری سفر ہے۔ کہیں شیر کا ڈر، کبھی کیڑے کا خوف، چوٹّوں، بٹ ماروں کا اندیشہ، چڑیلوں، چھلاّووں کا خدشہ۔ ان دنوں نہ تمہاری گھڑی تھی اور نہ یہ بجلی کی روشنی تھی۔ اوپر تارے تھے اور نیچے دھڑ دھڑ جلتی ہوئی مشعلیں تھیں۔ کوئی مشعل اچانک سے بُجھ جاتی تو دل دھڑک کر رہ جاتا۔ کبھی کوئی تارا ٹوٹتا اور آسمان پر لمبی لکیر کھنچی چلی جاتی۔ دل دھڑکنے لگتا کہ یاالٰہی! خیر! مسافرت میں آبرو قائم رکھیو! رات اب گھنٹوں میں گزرتی ہے، آگے عمریں گزر جاتی تھیں مگر رات نہیں گزرتی تھی۔ رات ان دنوں پوری صدی ہوا کرتی تھی۔"(۶)

"دہلیز" ایک معصوم بے بس لڑکی کی کہانی ہے۔ صفیہ اپنے بچپن کے سنہرے دن، کالی کھوئی اور کاٹھ کباڑ والی کوٹھری میں چُھپن چُھپائی، آنکھ مچولی، اندھا بھینسا اور چور سپاہی کھیلا کرتی۔ اور ہر بار اماں جی اور آپا جی سے ڈانٹ کھایا کرتی۔ اماں جی کا کہنا تھا کہ اس کوٹھڑی میں ہزاروں سال پرانا سانپ رہتا ہے۔ کسی دن آنکھوں میں جھانک لیا تو؟ پھر اماں جی اس پُراسرار سانپ سے متعلق اپنے سسر، ساس، شوہر اور خود کے ساتھ گھٹنے والے کئی واقعات سناتی۔ اس سانپ کے امر ہونے کی کہانیاں، جیونی بوٹی، داستانیں، مافوق الفطرت عناصر سبھی کو سناتی رہتیں اور جھرجھریاں بھرتی رہتیں۔ ایک بار ایک بوڑھی نوکرانی کو جب چھل سے دلہین شہزادی بنا کر مسہری میں بٹھا دیا گیا اور وہ شہزادے کا سوچ کے کانپ رہی تھی تو یہی سانپ تھا جس نے لونڈی کو جوان پری بنا دیا:

> "دیکھتے دیکھتے سارے ہی بال کالے ہو گئے اور یہ لمبے کہ چُٹیا کولہے سے نیچے بل کھاوے تھی۔ شہزادہ جو داخل ہو گیا تو ششدر رہ گیا۔ سمجھا کہ عروسی کے کمرے میں مسہری نہیں بچھی، کوئی پری کا کھٹولا اترا ہے۔ دلہن ہے یا کہ پری۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ بدن میدے کی لوئی کی طرح، ناگن سی لہراتی زلفیں، وہ تو دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔"(۷)

لڑکپن میں صفیہ کے بال بھی کتنے گھنے اور چمکدار ہوا کرتے تھے۔ اس کا بدن ہاتھ لگائے میلا ہوتا تھا۔ مگر اب ڈھلتی عمر اور گھٹتی جوانی اپنے ہونے والے شہزادے کے انتظار میں اور بھی ماند پڑ چکی تھی۔ اچانک ایک دن اسے اپنا چُھٹپن، لڑکپن اور اماں جی کی دیومالائی باتیں شدت سے یاد آنے لگیں۔ پھر اچانک وہ بوڑھی لونڈی کو خوبرو پری بنا دینے والا کالا ناگ یاد آیا۔ صفیہ اس کی کھوج میں کباڑ والی پراسرار کوٹھڑی کی دہلیز پھلانگ گئی۔ مگر وہاں سے بھی بے آس لوٹی۔ یہ افسانہ ان معصوم لڑکیوں کی کہانی ہے جو اپنے شہزادے کی آس میں بیٹھی بیٹھی بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور آخر ارمانوں سے سِلا "چوتھی کا جوڑا" ایک دن ان کا کفن ہو جاتا ہے۔

افسانہ "سیڑھیاں" بچپن کے خوابوں کے حقیقت بن جانے کی کہانی ہے۔ اندھیری رات میں چھت پر بچھی چارپائی پر لیٹے چند دوست رشتہ دار جو اپنے اپنے خواب سنا رہے ہیں۔ پچھلی رات رضی کے خواب میں آنے والا بڑے امام باڑے کا بڑا علم ان کی تشویش بڑھا رہا ہے۔ سبھی تو اپنی بستی چھوڑ پاکستان چلے آئے تھے۔ اس محرم بڑے علم کا جلوس کسی نے نہ نکالا ہوگا اس واسطے۔ اس سخن پر سیّد کا ذہن ماضی کی گہری وادیوں میں چل پڑا۔ وہ پیچھے چھوٹ جانے والی بستی، اس کی یادیں، بڑا امام باڑہ، جلوس کی تاب و تب، کنواں، تہہ خانہ، اندھیاری سیڑھیاں، اس میں رہتا پُراسرار سانپ، بُندی کے ساتھ بتائے خوبصورت پل، وہ کٹتی پتنگ، چھت کا غصیل بندر، اگرچہ وہ سب حقیقت تھا مگر آج ایک دھندلا خواب بن چکا تھا۔ پھر اس نے اس خواب کو یاد کیا جو اس نے بچپن میں دیکھا تھا اور جھرجھری بھرتے ہوئے ماں جی کو سنایا تھا:

> "ایک بہت بڑی پتنگ کٹ گئی اور اس کی ڈور آنگن سے میرے سر پہ آ گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو تھا مگر نکل گئی۔ میں تیر کی طرح سیڑھیوں میں دوڑا۔۔۔ ایک موڑ، دوسرا موڑ، سیڑھیاں، اور سیڑھیاں، اس کے بعد سیڑھیاں... جیسے چڑھتے چڑھتے صدیاں گزر گئی ہو... پھر کھلا زینہ آ گیا، مگر سیڑھیوں کا پھر وہی چکر، سیڑھیاں، اور سیڑھیاں، اور سیڑھیاں..." (۸)

اماں جی نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ پتنگ غریب الوطنی اور پُرپیچ سیڑھیاں مصیبت کی خبر ہیں۔ انہوں نے سیّد کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ ایسے خواب آئندہ نہ دیکھے اور نہ ہی کسی کو سنائے۔ بس چپکے سے صدقہ دے دیا کرے۔ ورنہ دوسروں کی بتائی تعبیریں سچ ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر آج سیّد اپنے خواب کی مکمل تعبیر دیکھ چکا ہے اور اب اس کی نیند اُڑ چکی ہے کہ کہیں کوئی خواب ہی نہ دیکھ لے۔

یہ ماضی، اساطیر اور دیومالا سے بُنی گئی ایک علامتی کہانی ہے۔ جس میں اپنی بستیاں چھوڑ کے سرحد کے اِس پار اور

اُس پار اجنبی دیسوں میں جانے والوں کے خوابوں کی ان چاہی تعبیر اور نامعلوم مستقبل کا خوف دیکھا جا سکتا ہے۔

"مردہ راکھ" لکھنؤ کے بڑے امام باڑے کے خدمت گار تفضل کی کہانی ہے۔ وہ ہر برس محرم میں تلواروں والا بڑا علَم اُٹھاتا، تاشا بجاتا، روٹی، دودھ اور شربت کی سبیل لگاتا اور دُلدُل کو سجاتا تھا۔ لیکن اب کی بار دُلدل کے اچانک مر جانے پر سبھی معززین و عزاداروں نے اس پر کئی سوال اُٹھائے۔ سبھی کو تشویش تھی کہ سبیل میں ملاوٹ اور کمی آتی جا رہی ہے۔ ذوالجناح کم خوراکی کی وجہ سے مارا گیا۔ اس محرم علَم خون روئے گا۔ امامؑ کی سواری اس محرم ہند اور لکھنؤ نہ آئے گی۔ تفضّل ان سوالوں کے بھار تلے دبا جا رہا تھا اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ مگر جب عاشور کی رات بڑا علَم برآمد ہوا تو وہ اپنی عقیدت اور جذبہ نہ چھپا سکا۔ اس نے علم کو دونوں ہاتھوں سے گھمایا۔ دانتوں میں تھاما اور ایسا گھوما کہ ہجوم اور عزاداروں سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ محبت کے دریا میں بہتا ہوا کربلا کے ریگستان میں جا پہنچا۔ ریگزار خون میں نہا چکا تھا۔ گرم لُو کے جھکڑ خیموں میں لگی آگ کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ پیاسی زبانیں تسبیح کر رہی تھیں۔ امام علیؑ ابن حسینؑ خاکِ کربلا پر سربسجود تھے۔ کربلا کے سبھی منظر تفضّل کی آنکھوں کے سامنے آتے چلے گئے:

> "اس نے کربلا میں قدم رکھتے ہوئے سوچا کہ جیسے سب اس پر گزری ہے۔ بازو بھی اس کے کٹے ہیں اور زنجیریں بھی اسے پہنائی گئی ہیں اور کربلا سے شام تک پیدل بھی اسے ہی چلنا ہے۔۔۔ تب اس نے سجدے سے سر اُٹھایا اور قافلے کے ہمراہ کانٹوں بھرے گرم راستوں پر اتنی دور چلا گیا کہ اس کے پاؤں پر ورم آنے لگی اور اس کے تلوے خون سے بھر گئے اور ہڈیاں تپش سے جل گئیں۔"(۹)

پھر جب وہ اس پُر سعادت سفر سے پلٹا تو ستارہ فجر نمودار ہو چکا تھا امام باڑے کے معزز عزادار سروں میں خاک روائے عاشورہ کے اعمال پڑھ رہے تھے۔ جلتے خیموں کی مردہ راکھ سبھی کے سروں میں بیٹھ چکی تھی۔

"مردہ راکھ" ایک غریب عزادار کے خلوص کی داستان ہے۔ جس کے اخلاص اور محبت پر سوال اٹھانے والوں کے سروں میں خاک اور سچے عاشق کو زیارتِ محبوب نصیب ہوئی۔ انتظار حسین کا اندازِ بیاں ایسا جاندار ہے کہ عزاخانوں، امام باڑوں کی روایات، ذوالجناح کا جلوس، علَم و تعزیہ داری، عرب و ہند کی رسوم کا گھال میل اور عاشورہ کے تمام تر مناظر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔

"مشکوک لوگ" ہمارے معاشرے کے واہموں اور وسوسوں کی کہانی ہے۔ جہاں سبھی لوگ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سبھی کا کردار، آمدنی، نوکری، حرکات، بات کرنے اور دیکھنے کا طریقہ تک سب شکوک و شبہات سے بھرا رہتا ہے۔ یہ رویہ معاشرے سے دائمی سکون چھین لیتا ہے اور ایک دوسرے کے لیے یہ سبھی "مشکوک لوگ" خوامخواہ کے واہموں اور وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسا معاشرہ بیمار کہلاتا ہے۔ ایک دوسرے کے بارے میں اچھے خیال رکھنے سے ہی معاشرہ تندرست ہو گا اور ترقی کی راہ پڑے گا۔

"شرم الحرم" بیت المقدس پر صیہونی طاقتوں کے حملے اور اسرائیل کے یروشلم پر قبضے کی داستان ہے۔ انتظار حسین عرب و عجم کے مسلمانوں کی غیرت پر سوال اٹھاتے ہیں کہ کیوں انہوں نے عمان، دمشق اور قاہرہ کی بربادی کو اپنی بربادی نہ جانا۔ کاش! وہ آپسی جھگڑے ختم کر کے اسے امتِ مسلمہ کا مسئلہ جانتے تو آج یروشلم اور اس کی دیوارِ گریہ اور یرمیاہ نبی کا نوحہ یوں سیلابِ گریہ نہ بنتا۔ کاش ہم سمجھتے کہ یروشلم کے بہادر بیٹے ہمارے بیٹے ہیں، بیت المقدس کی بیٹیاں شرم الشیخ بھی ہیں اور شرم العرب بھی۔ اور یہاں تک کہ شرم العجم بھی۔ وہ دنیا جہان کے مسلمانوں کے لیے شرم الحرم تھیں:

> "میں نے عمان، شام اور مصر کے ڈھے جانے کی خبریں سنیں اور زندہ رہا، پھر میں نے یروشلم کے گر جانے کی منادی سنی اور ڈھینے لگا۔۔۔ میں پکارا کہ اے بیت المقدس کی بیٹی! کمر پہ ٹاٹ باندھ اور بین کر کہ تیرے

فرزند خاک اور خون میں غلطان ہوئے اور تیری کنواری بیٹیاں گلی گلی رسوا ہوئیں۔۔۔ بیت المقدس کی بیٹی بے حرمت ہوگئی، شرم العرب، شرم العجم، شرم الحرم، شرم الم" (۱۰)

افسانہ "کانا دجال" فلسطین پر یہودیوں اور امریکہ کے قبضے اور اسرائیل کے قیام سے متعلق ہے۔ محسن کے اماں ابا اسے مسلمانوں کا شاندار ماضی بتارہے ہیں کہ کس طرح طرابلس کی جنگ میں ہندوستانی ماؤں بہنوں بیٹیوں نے اپنا زیور بطورِ امداد دے دیا تھا۔ کس طرح ملت کے بیٹے بے تاب تھے۔ مگر آج یروشلم پر حملہ ہوا اور کسی کو کچھ نہ ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں اور خلافت والے شوکت علی جو مر گئے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر تو اسی ارضِ مقدس میں سوگئے۔ تو اب کون ہو جو امن کے اس شہر کو فتنہ بازوں سے بچائے؟ کیا ہم بھول گئے کہ یہ ہمارا قبلہ اوّل ہے۔ ہمارے رسول ﷺ تو اسی مسجدِ اقصیٰ سے معراج پر گئے تھے۔ جہاں ہمارے نبیؐ بلند ہوئے تھے وہاں ہم پست ہوگئے۔ محسن کے ابا نے کہیں سے سنا تھا کہ یہودیوں کے جرنیل کی ایک آنکھ نہیں ہے جس پہ وہ سبز پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ کیا وہی تاشا بجاتا بڑے گدھے پر سوار شعبدہ باز کانا دجال آگیا؟ تو اب امام مہدیؑ، جو رسول ﷺ کے عزت والے بیٹے ہیں، ظہور فرمائیں گے۔ تو یہ وجہ ہے کہ مسلمان بکھر گئے ہیں۔ روایتیں تو یہی بتاتی ہیں کہ بہت سے مسلمان کانے دجال کے ساتھ جنگوں میں مارے جائیں گے۔ بہت سے اس کے پیچھے دوڑ پڑیں گے اور امامؑ کی فوج کا ساتھ صرف تین سو تیرہ خالص مسلمان دیں گے۔ محسن سوچنے لگا کہ پہلی جنگ بدر میں بھی تو کل تین سو تیرہ تھے۔ اور امامِ مہدیؑ کے سپاہی، یروشلم کے محافظ بھی اتنے ہی رہ جائیں گے :

"یہ ہمارا ماضی ہے یا مستقبل؟ وہ جو آغاز تھا وہی انجام بھی ہے۔ جہاں ہم بلند ہوئے، وہیں ہم پست ہوگئے۔ کانا دجال تاشے باجے بجاتا آئے گا۔ کانا دجال۔ کان کا میل، گدھا، گیہوں، امریکہ اور اس کی ناجائز اولاد۔"(۱۱)

" بگڑی گھڑی " ماسٹر نیاز گھڑی ساز، ان کے گاہک، دُکان پر حاضری دینے والے یار دوست اور دُکان کے باہر دری بچھائے بیٹھے ابو نجومی کی کہانی ہے۔ ماسٹر نیاز سائنس اور اس کے کرشموں کے قائل ہیں تو حاجی تراب علی اسلامی معجزات و کرامات کے۔ جبکہ ابو نجومی انسان کو ستاروں کے آگے مجبور مانتا ہے۔ اس افسانے کا بیانیہ جاندار ہے اور یہی بیانیہ، علمِ نجوم کی سوجھ بوجھ اور چند ایک اشارے ایسے ہیں جو اس تحریر کو بزور افسانہ منواتے ہیں۔ ورنہ کہانی کچھ خاص نہیں۔ یہاں تک کہ اسے کسی خاص نتیجے تک بھی نہیں پہنچایا گیا ہے۔

" دوسرا گناہ " انتظار حسین کے خوبصورت افسانوں میں سے ایک ہے۔ اساطیر، تاریخ اور علامتوں سے گہرے معنی پیدا کیے گئے ہیں۔ ایک قوم جو معبدوں، مقبروں اور حویلیوں سے نکل کر کھلے میدانوں میں کھیتی باڑی کرتی ہے۔ محنت، ایمانداری اور انصاف نے اسے خوشحال تر بنایا۔ جفاکشی اور گندم کے آٹے نے ان کی عمریں بڑھادیں۔ مگر پھر ایک سردار جمران آرام طلب ہوا۔ اُس نے اپنا آٹا چھلنی سے چھانا، کپڑے سے باریک کر کے کھایا اور چھان رعایا میں بانٹ دیا۔ پھر نرم کپڑا پہنا، گھر کی دیوار اونچی کی، مضبوط دروازہ لگایا۔ جس سے رعب کے ساتھ ساتھ لوگوں میں تجسس نے بھی جنم لیا اور پہلی بار چوری نے زقند باندھا۔ جمران نے آرام طلبی میں پیدل چلنے کو ترک کیا اور اپنی خوبصورت بگھیوں واسطے درختوں اور فصلوں کو کاٹ کے سڑکوں کا جال بچھوایا۔ گندم کا چھان اب رعایا کی بجائے اس کی گھوڑیاں کھانے لگیں۔

گندم کی قلت ہوئی تو لوگوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی۔ جمران کے باپ کا دوست الیملک اس سے ناراض ہوا تو اس نے الیملک کو بیوی سمیت علاقہ بدر کر دیا۔ اگرچہ الیملک کا بیٹا جمران کی نازک اندام بیٹی کے عشق میں دیوانہ ہو کے مر گیا تھا۔ لیکن الیملک نے ہمت نہ ہاری اور دوسرے علاقے میں جا کر زمین کا سینہ چیرا اور خوب کھیتی اُگائی۔ پچاس ساٹھ سال بعد جمران کے علاقے میں خوب قحط پڑا۔ گندم، جو اور دوسری ضرورت کی چیزیں حرص، مطلب، چوری اور ذخیرہ اندوزی نے ہڑپ لی تھیں۔ چنانچہ قافلے اس علاقے سے نکل کر الیملک کی سرسبز زمین میں پناہ لینے لگے۔ اب وہ علاقہ مکمل ہو گیا مگر :

"سب سے آخر میں وہ قافلہ آیا جس کا بوڑھا سب کے درمیان بیٹھ کر سب کا بزرگ بنا اور منصف ٹھہرایا گیا۔ وہ بزرگ یہاں اس حال میں پہنچا تھا کہ اس کے پاس کچھ ساز و سامان نہیں تھا، سوائے ایک آٹے کی چھلنی کے اور یہ پہلی آٹے کی چھلنی تھی جو اس نئی بستی میں پہنچی تھی۔"(۱۲)

جو لوگ مقبروں، معبدوں اور حویلیوں کی گھٹن سے نکل کر آزاد ہوئے تھے۔ ان کی اولادوں نے پھر اپنی لالچ، حرص، طمع اور آرام طلبی کے داؤ میں آکر دیواریں اور سڑکیں بناڈالی تھیں، مگر جب ان میں سے ایک مردِ جفاکش نے پھر محنت اور ایمانداری سے فصلیں اگائیں تو قحط زدہ قافلے سکون کی تلاش میں اس کی بستی آپہنچے۔ لیکن وہ خالی ہاتھ نہ تھے، اس بستی کو بھی اجاڑنے کا سامان، چھلنی اور آرام طلبی ان کے ہم رکاب تھی۔ آرام طلبی، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، حرص، طمع، لالچ، چوری، رشوت اور ناانصافی ایسے ناسور ہیں جو قوموں کو برباد کر دیتے ہیں۔ انسان چاہے اپنی محنت، جفاکشی اور ایمانداری سے کتنی بھی بستیاں آباد کر لے مگر معاشرے کے یہ ناسور ان تمام تر بستیوں کو سیسہ کر دیں گے اور بھوک اور ویرانہ ان کا مقدر ٹھہرے گا۔ اس لیے انسان اگر خوشحال اور آباد رہنا چاہتا ہے تو اُسے ان ناسوروں سے پیچھا چھڑانا ہوگا۔

افسانہ "دوسرا راستہ" میں لاہور شہر میں ہونے والے ہنگاموں کو اسٹیشن جانے والی ایک ڈبل ڈیکر بس کے مسافروں کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ بس رکاوٹوں کے سبب دوسرے راستے سے جارہی ہے مگر وہاں بھی حالات دگرگوں ہیں۔ مسافروں کو ڈر ہے کہ وہ ان فسادات میں جانے اپنی منزل تک پہنچ بھی پائیں گے یا راستے میں ہی کسی حادثے کا شکار ہو جائیں گے۔ بس کے مسافروں کی تشویش، آپسی چہ مگوئیاں، ماضی و حال کے قصے، بس کا اندرونی و بیرونی منظر اس افسانے کا کل جہان ہے۔

"اپنی آگ کی طرف" ایک عمارت میں لگنے والی آگ اور اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کی مختصر کہانی ہے۔ کہانی سنانے والے کا دوست زمانہ طالب علمی سے ادھیڑ عمر تک اس عمارت کے پرانے خستہ حال کمرے میں رہا تھا اور اس نے بھی دوست کے ساتھ ایک عرصہ گزارا تھا۔ کتنی خوشیاں، غمیاں، یادیں اور کتنی وابستگی تھی اس کمرے سے انہیں۔ آگ بھڑکنے، لوگوں کی بے چینی، افراتفری اور مدد کا منظر ملاحظہ فرمائیے :

"مکین مکانوں سے، مال اسباب دکانوں سے باہر نکلا پڑا تھا، جیسے کسی نے شہد کے چھتے کو آگ لگادی ہو اور بھڑیں بھڑک کر نکل پڑی ہوں، بھنبھنا رہی ہوں۔ چیخیں، آہیں اور ایک دوسرے کو آوازیں، غصے بھری آوازیں اور دردناک آوازیں، اذیت بھری آوازیں، گرتے پڑتے بچے، عورتیں اور بوڑھے، باہر ڈھلتا ہوا سامان، بھاگ کر آتے ہوئے لوگ۔ اس غیر وقت میں کہ ابھی صبح نہیں ہو پائی تھی کہ جس نے شور سنا آپہنچا۔ کچھ پانی کی بالٹیاں بھر کر لائے، کچھ ڈھاٹے منہ پر باندھے اندر گھس پڑے اور اندر کا سب سامان باہر پھینکنے لگے ۔"(۱۳)

آخر وہ دونوں اس پھیلتی اور قہر ڈھاتی آگ سے پرے نکل آئے۔ چائے کے ڈھابے پر آگ لگنے سے متعلق تبصرے سنے۔ سارا دن شہر کے مختلف کونوں میں بے چین گھومے، رات گئے تک مختلف چائے خانوں، دُکانوں، ویرانوں اور گنجانوں میں گھومتے رہے اور آخر تھک ہار اپنے جلے ہوئے خرابے، اپنے ڈھیتے گھر کی طرف، اپنی آگ کی طرف پلٹ گئے۔

مجھے یاد ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے قدیمی ہاسٹل میں آگ بھڑک اُٹھی تھی اور کمرے دھڑ دھڑ جلتے جارہے تھے۔ میں ہاسٹل کے بڑے سے میدان میں کھڑا، ہجوم کی چہ مگوئیوں، غم و غصے اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرنوں سے الگ، آگ کی لپیٹ میں آچکے اپنے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات کی پروا نہ تھی کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، کیا ہوا۔ پرواہ تھی تو اس روشن دان کی، اس دروازے کی، کمرے کے پنکھے اور دیال کی لکڑیوں سے بنی اس قدیم چھت کی۔ اپنی کتابوں اور سندوں سے بھی کہیں زیادہ اپنے پنکھے، الماری، قالین اور چارپائی کی، جن کے ساتھ میرے کئی برس گزرے

تھے۔ میں انہیں یوں قطرہ قطرہ سسک سسک کر جلتے پگھلتے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس افسانے میں بھی ایک انسان کے اسی احساس کو دکھایا گیا ہے۔

"لمباقصّہ" انتظار حسین کے مختصر ترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ تین صفحات پر مشتمل دو دوستوں کی کہانی، جو ایک دوسرے کو اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سنانے کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن اکثر بیچ میں دیگر دوستوں کی مداخلت پر سیاسی تبصروں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ آخر ایک دن جب انہیں ایک دوسرے کو یہ "لمباقصہ" سنانے کا موقع مل ہی گیا تو وہ اندر ہی اندر اس کی یادوں میں ایسے گم ہوئے کہ نیند اور تھکاوٹ نے غلبہ پالیا۔ اور پھر وہ لمباقصہ دوبارہ حالاتِ حاضرہ کے تبصروں میں بدل گیا۔ وقت انسان کو ایسا تھکا دیتا ہے کہ انسان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ بھی اس کے اندر سو جاتا ہے اور وہ اس کو سنانے سے پہلے ہی چُور ہو جاتا ہے۔ کچھ رہ جاتا ہے تو دوسروں کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور حالاتِ حاضرہ پر چھوٹے چھوٹے بے مقصد، بے جوڑ تبصرے۔ 'لمباقصہ' انسان کے اندر میٹھی یادوں کی شکل میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اب وہ کسی کو سنائے بھی تو کیسے...!

"وہ اور میں" بھی ایک مختصر افسانہ ہے۔ ایک آدمی ہوٹل کے واش روم سے نکلتے ہی خالی برتنوں والی ایک میز پر شک بھری نگاہ ڈالتا ہے۔ ہوٹل کے مالک اور بیروں سے کچھ دیر پہلے اُس ٹیبل پر بیٹھے مشکوک آدمی سے متعلق استفسار کرتا ہے۔ مگر کسی نے بھی اس طرف دھیان نہ دیا تھا۔ اس ٹیبل پر جس بیرے کی ڈیوٹی تھی وہ بھی کسی ضروری کام سے بازار جا چکا ہے۔ بیرے کے انتظار میں وہ شکوک و شبہات کے سمندر میں ڈھیروں غوطے لگاتا ہے۔ آخر کون تھا وہ شخص؟... مگر مارکیٹ سے لوٹ کر بیرا اُسے اور حیرانی میں ڈال دیتا ہے کہ 'اُس ٹیبل پر آپ ہی نے تو کھانا کھایا اور چائے سگریٹ پی ہے'۔ اس شخص کو بھی یہی خوف تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس ٹیبل پر بیٹھا وہ مشکوک شخص" کہیں میں تو نہیں تھا؟"(۱۴)

بعض دفعہ انسان شکوک و شبہات میں ایسا مبتلا ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ساتھ خود اپنی ذات اور اپنے کردار سے بھی خوف کھانے لگتا ہے۔ شک اسے اندر سے کھوکھلا اور بے اعتبار کر دیتا ہے۔

"وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" انتظار حسین کی اہم اساطیری اور علامتی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ یاجوج ماجوج کو سکندر (ذوالقرنین) بادشاہ نے ہزاروں سال پہلے جس مضبوط دیوار کے اندر، پتھریلی وادی میں قید کیا تھا، وہ روز اسے چاٹ چاٹ کر انڈے کے چھلکے برابر کر دیتے۔ مگر پھر تھک جاتے اور نیند ان پہ غالب آ جاتی۔ پھر صبح دیکھتے کہ دیوار اسی طرح مکمل ہو چکی ہے۔ مگر وہ ہمت نہ ہارتے اور ہر روز اسے چاٹتے رہتے۔ لیکن پھر ایک دن دونوں کی اولاد نے سوچا کہ سدِ سکندری کو چاٹ لینے کے بعد ان میں سے پہلے کون طبرستان کے میٹھے چشموں پر جا پہنچے گا اور قبضہ جمائے گا۔ کس کے ہاتھ باغات آئیں گے اور کس کو چٹیل میدان نصیب ہوں گے :

> "ماجوج کی بیٹی چلا کر بولی کہ 'اے میرے پردادا کے بیٹے کے بیٹے! کیا تم اس بات سے انکاری ہو کہ یاجوج اور ماجوج ایک باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور ایک ماں کی گود میں پلے بڑھے ہیں؟' یاجوج کے بیٹے نے فیصلہ کن انداز میں کہا: 'اے ماجوج کی بیٹی! سُن! میں اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ ہم یاجوج کے بیٹے ہیں، قومِ یاجوج ہیں اور صرف اپنے پہاڑ سے پہچانے جاتے ہیں۔"(۱۵)

اس پر یاجوج اور ماجوج کی اولاد میں خوب خون ریزی ہوئی۔ وہ ہر رات ایک دوسرے کو کاٹنے مارنے لگے۔ یہاں تک کہ پتھریلی وادی خون سے رنگین ہو گئی۔ جب یاجوج ماجوج کو اپنی اپنی اولاد کے قتل کی خبر ملی تو وہ دونوں ایک دوسرے کے زبردست دشمن ہو گئے اور سدِ سکندری کے بجائے ایک دوسرے کو چاٹنے لگے۔ اب وہ ہر رات ایک دوسرے کو اتنا چاٹتے اتنا چاٹتے کہ انڈے کے چھلکے برابر ہو جاتے ہیں اور پھر تھکاوٹ اور نیند ان پر غالب آ جاتی ہے۔ صبح وہ تازہ دم ہو کر

اٹھتے ہیں ایک دوسرے پر چلّاتے ہیں اور شام ہوتے ہی ایک دوسرے کو چاٹنا شروع کر دیتے ہیں اور وہ دونوں بلند پہاڑوں جیسے یاجوج ماجوج انڈے کے چھلکے برابر رہ جاتے۔ پھر ہزار سالہ بوڑھا پہاڑ کی اوٹ سے نکل کر یافث کیاس اولاد پر افسوس کرتا ہے :

"اے یاجوج ماجوج! تمہارا بُرا ہو کہ تم سدِ سکندری کو تو نہ چاٹ سکے، مگر ایک دوسرے کو سچ مچ چاٹے لے رہے ہو۔" (۱۶)

یہ صرف یاجوج ماجوج کا قصہ نہیں بلکہ پوری آلِ آدم اور آلِ نوح کی کہانی ہے۔ جو آج تک بہتر سے بہتر وسائل کی لالچ اور ہوس میں ایک دوسرے کو مار کاٹ رہے ہیں۔ حرص اور طمع نے انہیں بھلا دیا کہ وہ کبھی ایک باپ اور ایک ماں سے جنمے تھے۔ لالچ اور کشت و خون کی کڑواہٹ نے آج تک انہیں میٹھے چشموں اور پھل دار نخلستانوں سے محروم رکھا ہوا ہے۔ بڑھتی لالچ انسان کو بربریت اور انسانیت سوزی کے راستے پر اتنا دور لے آئی ہے کہ اب اسے دنیا کی حقیقت کو جان چکنے والوں کی نصیحت تک سنائی نہیں پڑتی۔

"اندھی گلی" دو دوستوں کی کہانی ہے۔ جو پردیس سے غیر قانونی طریقہ سے اپنے گاؤں آئے ہیں۔ پہچانے جانے اور پکڑے جانے کا خوف مسلسل ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ اپنے گاؤں کے کونے کونے کو بخوبی جانتے تھے مگر وقت اور ان چاہی ترقی نے سب بدل ڈالا تھا۔ آخر انجان لوگوں، کٹ چکے درختوں کے تنوں، ڈھے چکی حویلیوں، نئی عمارتوں اور بند گلیوں کے حصار میں قید ہو گئے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کھینچنے والے اپنی ہی بستی کی اندھی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

"شہر افسوس" انتظار حسین کی نمائندہ علامتی کہانی ہے۔ جسے تقسیم، ہجرت اور فسادات کے باب میں لکھا گیا ہے۔ مسخ چہروں والے تین آدمی اپنی مردہ آواز میں فسادات کا قصہ سنا رہے ہیں۔ پہلا آدمی بتاتا ہے کہ اس نے ایک ہندو لڑکے کے ہاتھوں اس کی جوان بہن کو ننگا کرایا۔ پھر اس ہندو لڑکے نے طیش میں آکر ایک بوڑھے کے ہاتھوں اس کی جوان بہو کو ننگا کرایا۔ پھر اس پہلے آدمی کے ہاتھوں اس کی بیٹی کو ننگا کرایا گیا۔ اس برہنہ وحشت نے اس پہلے آدمی کے باپ کی جان لے لی اور اس کی بیوی غیر محفوظ ہوئی، یہ سب دیکھ کر پہلے آدمی کی روح مر گئی اور چہرہ مسخ ہو گیا۔ دوسرے آدمی نے اُس ننگی سانولی ہندو لڑکی کی عزت لوٹ لی تھی۔ شیطنت نے اس کا چہرہ بگاڑا اور اسے اندھی گلیوں، ویران کوچوں، سنسان راستوں اور تعفن بھری لاشوں والے شہر خرابی کو چھوڑ کر خوابوں کے دیس بھاگنا پڑا۔ مگر وہ نیا ملک تو اس سے بھی زیادہ ویران اور لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ کیمپوں میں بچے بھوک و پیاس سے بلک رہے تھے۔ ماؤں کی چھاتیاں خشک ہو چکی تھیں۔ چشمے ویران اور دھرتی خون سے سیراب تھی۔ دوسرے آدمی نے اپنی مردہ آواز میں ہجرت زدوں سے پوچھا :

"اے لوگو! کچھ تو بتلاؤ کہ یہ کیسی بستی ہے۔ اس پہ کیا مصیبت ٹوٹی ہے کہ گھر قید خانے بنے ہوئے ہیں اور گلی کوچوں میں خاک اڑتی پھرتی ہے؟ جواب ملا کہ اے کم نصیب! تو اس لمحے شہر افسوس میں ہے اور ہم سیاہ بخت یہیں دم سادھے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ میں نے پوچھا کہ خانہ بربادو! تم نے دارالامان کو کیسا پایا ہے؟ بولے کہ خدا کی قسم! ہم نے اپنوں کے ظلم میں صبح دیکھی۔۔۔ میں نے افسوس کیا اور کہا: 'اے بزرگ! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ اپنی دھرتی سے بچھڑ جاتے ہیں، پھر کوئی بھی زمین انہیں قبول نہیں کرتی!"(۱۷)

وہ سب اس سچ کو پا چکے تھے کہ آسمان تلے سب جھوٹ ہے۔ انسانیت، خواب، جنم بھومی شہر خرابی، دارالامان شہر افسوس، سب جھوٹ ہے۔ یہاں کچھ حق نہیں، سب باطل ہے۔ اگر کچھ ہے تو اسے ویرانہ، وحشت، بربریت، یاسیت اور ناامیدی کہیے۔ دوسرے آدمی کی روح کو اس غم نے مار ڈالا تھا کہ وہ خود تو اپنے مسخ چہرے کے ساتھ ہجرت کر آیا تھا مگر باپ کی لاش کو وہیں سڑتا چھوڑ آیا تھا، لیکن مسخ چہرے والا تیسرا آدمی اب تک بے خبر تھا کہ پہلے دو مسخ آدمیوں کی طرح وہ بھی

مر چکا ہے یا ابھی زندہ ہے، اس پر پہلا آدمی اسے یاد دلاتا ہے کہ اگر تو مرا نہیں، تو ضرور تو اسیر ہے یا پھر لاپتا۔ یوں بھی مسخ چہرے نے تیری پہچان چھین لی ہے۔ اس پر دوسرا آدمی اپنی مردہ آواز میں طیش بھرتے ہوئے کہتا ہے :

> "اے بد شکلو! کیا میں نے تم لوگوں کو گیا کے آدمی والی بات نہیں بتلائی تھی کہ ہر زمین ظالم ہے اور آسمان کے نیچے ہر شے جھوٹ ہے اور اکھڑے ہوؤں کے لیے کہیں بھی امان نہیں۔۔۔ اے لاپتا آدمی! بیٹھ جاو! اور مت پوچھو کہ تم کہاں ہو! اور جان لے کہ تم مر گئے ہو۔" (۱۸)

غیر منصفانہ تقسیم، انسانیت سوزی، جان، مال اور ناموس کا چِھن جانا، اپنی دھرتی ماں کا کٹھورپَن، بے حسی، قتل و غارت گری، دارالامان کی آبروریزی، آزادی کے خوبصورت خواب نے کتنی بھیانک تعبیر پائی تھی۔ "شہرِ افسوس" اسی تعبیر کا نوحہ ہے۔

انتظار حسین کے اُسلوب کی اگر بات کریں تو یہ ایک جناتی اسلوب ہے یا اسے دیوک کہہ لیجیے یا ملکوتی یا آسان بھاشا میں معجزاتی۔ بات یہ ہے کہ انتظار حسین کی کہانیوں سے بھی کہیں زیادہ جاندار شے ان کا اسلوب ہے۔ کہانی آپ کو بھلے نہ پکڑے مگر اسلوب ایسا گھیرے میں لے گا کہ آپ اس سے جان نہیں چھڑا پائیں گے۔ کہنے کا ڈھنگ ایسا سہل اور سادہ ہے کہ آپ فوراً ہی قبول لیں گے اور وہ بھی ان جانے میں۔ یہاں تک کہ آپ کی اپنی تحریروں میں بھی انتظار حسین ہی بولنے لگیں گے۔ پھر اس اسلوب سے پیچھا چھڑانے کے لیے آپ کو سو کھونٹ پھلانگنے پڑیں گے۔ خود مجھے اس ہفت اقلیم کو پار کرنے میں کئی ثقیل کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی تھی۔ ادیب اپنی تحریر کو اعتبار بخشنے کے لیے اور ادبی بنانے کو تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور بیان و بدیع کے جانے کن کن حربوں سے کام لیتے ہیں اور کتنی تکنیکوں سے سجاتے ہیں مگر انتظار حسین اپنے اسلوب میں بلا کی سادگی اور قصہ خواں عورتوں کا سا انداز لے آتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کہانی مَیں نہیں میرے اندر بسی میری نانی اماں سناتی ہیں، اور جب آپ انتظار حسین کی تحریر پڑھیں گے تو آپ کو لگے گا کہ تجربہ کی بھٹی میں پک چکی کوئی بوڑھی اماں قدیم داستان سنا رہی ہے۔

انتظار حسین ماضی سے سبق لینے اور حال کی تربیت کرنے کے قائل ہیں۔ مگر یہ تربیت وہ نہیں جو ترقی پسندوں اور اصلاح پسندوں نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ بلکہ وہ صرف چوکنا کر دینے تک کو اپنی ذمہ داری جانتے ہیں۔ وہ معاشرے سے کہیں زیادہ فرد اور ذات کی تربیت کے قائل ہیں۔ فرد کا بھلا ہو گا تو معاشرے کا بھی بھلا ہو جائے گا۔ اس لیے ان کے افسانوں میں خارجیت سے کہیں زیادہ داخلیت ہے۔ وہ فرد کی جُون بدلنے، کایا کلپ ہونے اور قالب بدل جانے پر زیادہ فکر مند نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اصل شے تو انسان کا انسان بنے رہنا ہی ہے۔ انسان ہے تو انسانیت ہے۔ اگر انسان انسان نہ رہا تو انسانیت کا کیا ہو گا؟ تو انسانیت کو بچانے کے لیے انسان کو بچائے رکھنا ضروری ہے۔ ہاں کبھی کبھار انتظار حسین داخلیت سے خارجیت کی طرف بھی آتے ہیں۔ اور فرد کے ذریعے معاشرے کی خبر بھی لے لیتے ہیں۔ اگر معاشرہ کچھ غلط کرے تو فرد اُسے ملامت کرتا ہے کہ میں تو فرد تھا تجھے کیا ہوا۔ تو نے کیوں ہجوم ہونا قبول کر لیا۔ کیوں حق اور سچ کا ساتھ نہ دیا۔ کیوں تجھے بھی خوف اور مصلحت نے نگل لیا۔

انتظار حسین اپنی علامتی کائنات کو اساطیر، دیومالا، قرآنی قصوں، قدیم داستانوں، نانی دادیوں کی روایتی کہانیوں، توہمات، لوک داستانوں، ماضی قریب کے واقعات اور آج کی صورتِ حال سے سجاتے ہیں اور قصہ کہانی کی روایت میں خوبصورت اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ کہانی کہنے کا انوٹھا انداز اور متذکرہ خوبیاں ہی انتظار حسین کو اُردو افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں لے آئی ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) آصف فرّخی، چراغِ شب افسانہ۔انتظار حسین کا جہانِ فن، (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء)،۴۷۔

(۲) انتظار حسین، گلی کوچے، (لاہور:شاہین پبلشرز،۱۹۵۲ء)،۸۔

(۳) انتظار حسین،مجموعہ انتظار حسین، (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء)،۵-۱۰۔

(۴) انتظار حسین،شہرِ افسوس، (لاہور:مکتبہ کارواں،اکتوبر۱۹۷۷ء)،۱۵۔

(۵) انوار احمد،اردو افسانہ:ایک صدی کا قصہ، (فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء)،۴۱۵۔

(۶) انتظار حسین،شہرِ افسوس،۳۰۔

(۷) ایضاً،۴۸۔ (۸) ایضاً،۸۲۔ (۹) ایضاً،۹۷۔ (۱۰) ایضاً،۱۳۲،۱۳۵۔

(۱۱) ایضاً،۱۴۷۔ (۱۲) ایضاً،۱۶۹۔ (۱۳) ایضاً،۱۹۳۔ (۱۴) ایضاً،۲۱۷۔

(۱۵) ایضاً،۲۲۲۔ (۱۶) ایضاً،۲۲۵۔ (۱۷) ایضاً،۲۵۶،۲۵۸۔ (۱۸) ایضاً،۲۷۰۔

References

(1) Asif Farrukhi, *Charagh e Shab e Afsana_ Intizar Hussain ka Jahan e Fun*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2016), p47.

(2) Intizar Hussain, *Gali Kochay*, (Lahore: Shaheen Publishers, 1952), p8.

(3) Intizar Hussain, *Majmoa Intizar Hussain*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2007), p5-10.

(4) Intizar Hussain, *Shehr-e Afsoos*, (Lahore: Maktaba Carvaan, Oct 1977), p15.

(5) Anwaar Ahmad, *Urdu Afsana- Aik sadi ka qissa*, (Faisalabad: Misaal Publishers, 2010), p415.

(6) Intizar Hussain, *Shehr e Afsoos*, p30.

(7) ibid, p48. (8) ibid, p82. (9) ibid, p97. (10) ibid, p 132, 135

(11) ibid, p147. (12) ibid, p169. (13) ibid, p193. (14) ibid, p217.

(15) ibid, p 222. (16) ibid, p225. (17) ibid, p256, 258 (18) ibid, p270.

❖❖❖